باب 15

متفرقات

آزادکشمیر میں غیر ریاستی جماعتیں۔۔۔سودوزیاں

342

ریاست جموں وکشمیر کی غیر قدرتی اور غیر آئینی تقسیم سے پہلے صرف دو جماعتیں آل جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس ہی ریاست میں سرگرم تھیں لیکن دونوں مرکزی قومی جماعتوں آل انڈیا نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ سے منسلک تھیں۔ دونوں جماعتوں کا دعویٰ تھا کہ وہ ریاست میں ان جماعتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مسلم کانفرنس تو قائداعظم کے اس بیان کا سہارا لیتی تھی کہ ''مسلم کانفرنس ہی ریاست میں مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت ہے''۔ حالاں کہ پاکستان کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قائداعظم نے اس وقت کے مسلم کانفرنس کے سیکریٹری جنرل اسحاق قریشی کو کہہ دیا تھا کہ فوری طور پر کشمیر میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

جب کسی بالادست قوت یا جماعت کی مقامی حکومت یا جماعت کو حمایت حاصل ہو تو مقامی جماعتوں کو ان کے فیصلے تسلیم کرنے پڑتے ہیں، ان کی بالادستی کے سامنے اپنی خودمختاری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ یہی کچھ آزادکشمیر میں ہوتا رہا جہاں مرکزی وزارت امور کشمیر کی قانونی معاونت سے آزادکشمیر کی حکومت میں مسلم کانفرنس کے صدر بنتے رہے جس وجہ سے مرکز کی مسلم لیگ کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ مرکز میں فوجی حکومتوں کے دوران پاکستان کا سیاسی چہرہ مسلم لیگ کے بینر کے

358

تحت نمایاں رہا اور آزادکشمیر میں مسلم کانفرنس نے قائداعظم کے اس فرمان کو سقہ بند حیثیت دلائی کہ مسلم کانفرنس ہی مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کا سردار عبدالقیوم خان مرحوم نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس طرح آزادکشمیر میں مرکزی جماعتوں کی ابتدائی آبیاری مسلم کانفرنس نے ہی کی۔ مقامی لیڈر مرکزی مسلم لیگ کے باضابطہ ممبر بھی رہے۔

جب پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو پاکستان میں آباد کشمیری باشندے بھی اس میں شامل ہو گئے جن کے ذریعہ آزادکشمیر میں بھی پیپلز پارٹی کی ہاہو سننے میں آنے لگی جس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے باضابطہ یہاں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس طرح باقاعدہ طور اس بڑی مرکزی جماعت کا قیام عمل میں آیا اور 1971 میں پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کی وجہ سے اس جماعت کو آزادکشمیر میں سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، جبکہ مسلم کانفرنس کو عملی طور پہلے سے ہی مرکزی حکومت اور مسلم لیگ کی سرپرستی حاصل تھی لیکن اس کا مقامی نام مسلم کانفرنس ہی رہا۔ اس کے علاوہ تمام مرکزی جماعتوں نے آزادکشمیر میں اپنا نظم قائم کرلیا ہے لیکن اس کے ساتھ آزادکشمیر یا کشمیر کا (لاحقہ) لگا کر۔ ان میں جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام کے دو گروپ، الغرض جتنی سیاسی جماعتیں اس وقت مرکز میں کارفرما ہیں ان کی شاخیں آزادکشمیر میں موجود ہیں۔ مرکزی جماعتیں تو آزادکشمیر میں موجود ہیں، لیکن مرکز کی تنظیم سازی، جماعتی عہدے داروں کے انتخابات اور مرکزی عہدوں میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس میں بھی مرکزی بالادستی کا خناس جھلکتا ہے۔

آزادکشمیر کا چوں کہ پاکستان کی حکومت یا نظام میں کوئی مقام نہیں ہے اس لیے یہاں کے لوگوں کی پاکستان حکومت یا سیاست میں کوئی حیثیت نہیں۔ مرکزی جماعتوں کے بننے کی وجہ سے آزادکشمیر کے لوگوں کا ربط وضبط، تعلقات، جان پہچان شروع ہوگئی جس کو بیرون ملک رہنے والے آزادکشمیر کے لوگوں نے مہمیز بخشی۔ مرکزی سیاسی قیادت کی یورپ میں پونڈز، یورو، اور ڈالرز اور گلف میں ریال، دینار سے پذیرائی ہوتی رہی، جس کے بدلے میں انہوں نے آزادکشمیر میں اپنی سیاسی دھونس کے علاوہ اپنے لوگوں کو مرکزی جماعتوں میں لایا اس طرح مرکز میں آزادکشمیر کے لوگوں کا اثر رسوخ پیدا ہو گیا۔

پاکستان میں آباد ریاستی مہاجرین نے بھی اس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا اور کشمیری مہاجرین کے نام پر آزاد کشمیر میں فرضی نمائندگی ہونے کی وجہ سے مرکز کی گرفت کو مضبوط تر کیا۔اس کے آزاد کشمیر کے لیے بے شمار نقصان ہیں□ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ مقامی مسائل کو براہ راست مرکزی لیڈر شپ تک پہنچانے میں آسانی پیدا ہوئی۔مرکزی بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ جو مقامی طور سیاہ وسفید کی مالک تھی محتاط ہوگئی کیوں کہ ان کی کارستانیاں براہ راست مرکزی لیڈر شپ تک پہنچنا شروع ہوگئیں۔سرحدی علاقوں میں سیکورٹی ایجنسیوں پر خصوصی گرفت ہوئی۔جو مقامی سیاست اور خباثت میں ملوث ہوکر جانبدار اور مخالفین کے کہنے پر لوگوں کو غائب کر دیتے تھے۔جنرل ضیاالحق مرحوم نے اس کا خصوصی نوٹس لے کر اس سلسلے کو بند کرایا اور اب تقریباً ختم ہے۔ایک عوامی جلسہ میں عبدالرشید کرناہی نے یہ مسئلہ ضیاالحق کے نوٹس میں لایا جس نے ایجنسیوں کی لگامیں کس لیں، ان کو اس کا کریڈٹ جاتا ہے۔عدالتوں کی مداخلت کی وجہ سے یہ معاملہ تقریباً ختم ہوگیا ہے۔آزاد کشمیر کے لوگوں کے مرکزی قیادت اور حکومت کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے یہاں اقتصادی بہتری کی راہیں کھلتی گئیں۔اس سے پہلے بھی یہاں سب کچھ مرکز ہی کرتا تھا لیکن یہ اس کی بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ کے ذریعہ ہوتا تھا۔جو آزاد کشمیر میں کسی کے پاس جواب دہ نہ تھی اور نہ اب ہے، لیکن مرکزی جماعتوں کی آزاد کشمیر میں حکومتیں بننے اور مرکز میں آزاد کشمیر کے لوگوں کے سیاسی اثر ونفوذ نے اسٹیبلشمنٹ کو آزاد کشمیر میں غلط کاریوں پر حرف تنقید اور باز پرس میں لایا جس سے آزاد کشمیر میں کماحقہ اعتدال پیدا ہوگیا۔

اب تو مرکزی جماعتوں کو آزاد کشمیر میں بالواسطہ طور آئینی حیثیت حاصل ہوگئی ہے کیوں کہ آزاد کشمیر کونسل کا چیئرمین بحیثیت صدر وزیراعظم پاکستان ہوتے ہیں جو بہر حال کسی جماعت سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔اس حوالہ سے وہ آزاد کشمیر میں اس جماعت کے مربی ومحسن کا کام کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وزارتِ امورِ کشمیر کے انچارج وزیر، جو عملی طور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے منتظم اعلیٰ ہیں، ہر لحاظ سے مرکزی اور مقامی معاملات پر چھائے رہتے ہیں اور اپنی پارٹی کے لیے مسیحا بن جاتے ہیں۔یوں مرکزی جماعتوں کے آزاد کشمیر میں براہ راست آمد سے مقامی اجارہ داری محدود ہوگئی ہے کیوں کہ عام جماعتی رکن کی رسائی مرکزی قیادت تک ممکن ہوگئی ہے جو مقامی حکومت اور مرکزی

حکومت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جو کام مرکزی جماعتوں کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے درمیانہ دار اپنا کمیشن وصول کرکے کرتے تھے وہ براہ راست مرکزی مداخلت سے ہوجاتے ہیں۔اس کمیشن اور دھونس سے محروم ہونے والے غیر ریاستی جماعتوں کا رونا روتے ہیں۔

مقبوضہ کشمیر میں مضبوط مقامی جماعتیں NC اور PDP ہندوستان کے خلاف وادی میں نفرت کی علامت کے طور مضبوط ہیں جو وہاں کے لوگوں کے ہندوستان کے خلاف جذبات کی عکاسی کرتی ہیں لیکن ریاست کا ہندوستانی آئین کے اندر ایک مقام مقرر ہے جس وجہ سے ریاستی کام کاج قواعد کار کے تحت چلتا رہتا ہے جبکہ آزاد کشمیر میں ایسا نہیں ہے، اس لیے حکومت پاکستان سے بالواسطہ رابطہ کا یہی ذریعہ ہیں۔مقبوضہ کشمیر میں مرکزی حکومت آئین اور مرکزی جماعتوں کے ذریعہ اپنا اثر و رسوخ مستحکم کر رہی ہے جبکہ آزاد کشمیر میں اس کی مخالفت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جہاں پاکستان کے خلاف کوئی نہیں اور نہ ہی ہندوستان کے حق میں، سوائے اس کے کہ ایسا کرنے والوں کی نیت خراب ہو۔

اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ آزاد کشمیر کی مرکز میں کوئی آئینی حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے اس مرکزی جماعت کے بااثر شخص یا اشخاص یا خاندان جس کے نام سے مرکزی جماعت چلتی ہے، وہ بالواسطہ عملی طور حکومت کرتے ہیں جبکہ مقامی حکومت Irrelevant ہوجاتی ہے۔2011 سے 2016 تک کی پیپلز پارٹی کی آزاد کشمیر کی حکومت کو عملی طور محترمہ فریال تال پور جو آصف علی زرداری صاحب کی ہمشیرہ ہیں براہ راست یا بذریعہ کارندے چلاتی رہیں جن میں سے چوہدری ریاض اور رضوان قریشی کے نام زبان زد عام ہیں جن سے مقامی وزیر اور وزیراعظم بھی نالاں تھے۔فوجی حکومتوں میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے جب یہاں کا عملی نظم ونسق مقامی ایجنسیوں کے اہلکار مری کے جنرل کی ہدایت کے تحت چلاتے رہے جن کو سابق چیف جسٹس مرحوم محمد یوسف صراف آزاد کشمیر کے Defacto چیف ایگزیکٹو کہتے تھے۔2016 میں مسلم لیگ ن کی حکومت بننے کے بعد کونسل اور مرکز کے سارے معاملات آزاد کشمیر سے متعلق وزیروں کے کنٹرول میں نہیں، تاہم مقامی حکومت میں ویسی مداخلت نہیں جو پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران تھی۔

اس کا ایک اور منفی اثر بھی ہے کہ مرکزی جماعتوں کی قیادت آزاد کشمیر کا مرکز میں کوئی آئینی مقام نہ ہونے کے باوجود بھی مرکزی ایشوز پر آزاد کشمیر کو ملوث کرتے ہیں جن کے ساتھ اس کا دور دور کا

تعلق بھی نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر ’’پانامہ اکاونٹ سکینڈل‘‘ کے ساتھ آزاد کشمیر کی حکومت یا کسی سیاسی لیڈر کی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کے باوجو مسلم لیگ (ن) کی مخالف جماعتیں اس کو آزاد کشمیر میں ایشو بنا رہی ہیں۔اس طرح 2010 میں جب آزاد کشمیر میں مسلم لیگ ن کی باضابطہ بنیاد رکھی گئی، یہاں میاں محمد نواز شریف نے متحدہ قومی مومنٹ (MQM) کو حرف تنقید اور ملامت بنایا جس کا آزاد کشمیر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

جب مرکز میں پرویز مشرف کی حکومت تھی اس وقت مرکز کی ملٹری انٹیلی جینس آزاد کشمیر میں سب کچھ تھی، جس کے خلاف کوئی شنید اور دلیل کی گنجائش نہیں تھی۔جبکہ سیاسی جماعتوں کی حکومت کے اقدامات کے خلاف بات تو ہوسکتی ہے اور کی جاتی ہے۔بہر حال مجموعی طور مرکزی جماعتوں کے یہاں براہ راست اثر سے فائدہ زیادہ ہے کیوں کہ آزاد کشمیر کا مرکز کے ساتھ جڑے رہنے کا یہ واحد سیاسی اور جمہوری راستہ ہے وگرنہ اس کا تعلق اسٹیبلشمنٹ کے ذریعہ ہے جو آمرانہ، حاکمیت پسند اور ایک لحاظ سے کلونیل ہے جس کے دوررس منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔اس کا واضح نقصان یہ ہے کہ مرکز میں اثر ورسوخ رکھنے والے ریاستی باشندے مرکزی حکومتوں کی مداخلت سے اپنے سارے جائز ناجائز کام دھڑلے سے کرواتے ہیں اور مقامی لوگ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

مرکزی جماعتوں میں سے ماسوائے مسلم لیگ ن اور نئی آنے والی جماعت تحریک انصاف کے، باقی سب کی مرکزی لیڈر شپ تک آزاد کشمیر کے ہر اس عام آدمی کی رسائی ہے جو اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ان دو جماعتوں کی مرکزی لیڈر شپ تک صرف ان کے ساتھ ذاتی تعلقات والے چند لوگوں کی بمشکل رسائی ہوسکتی ہے۔اس لیے کشمیر سے تعلق رکھنے والے جو لوگ بھی ان کے فیملی ملازم یا اس سے قریبی تعلق رکھتے ہیں وہ کشمیر کے کسی بھی بڑے سے بڑے لیڈر سے زیادہ اثر ورسوخ رکھتے ہیں اور جب مرکز اور آزاد کشمیر میں ایک ہی جماعت کی حکومت ہو تو مرکز جو چاہے ان لوگوں کے فائدے کے لیے ٹھونستا ہے اور مقامی حکومت اس کو اپنے لیے بخشش کا باعث سمجھتی ہے۔عام کارکن کا خیال رکھنے میں پیپلز پارٹی کا کوئی ثانی نہیں ہے جس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز کر گزرنے کو تیار ہوتی ہے۔پیپلز پارٹی میں Initiative اور Drive ہے جبکہ دوسری جماعتوں میں جمود ہے، وہ تذبذب کا شکار رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے کہیں ویسا نہ ہوجائے۔

سیاست دان جب اقتدار سے باہر اور بے اختیار ہوتے ہیں تب تو ہر ایک کے لیے بچھ بچھ جاتے ہیں لیکن جب اقتدار میں ہوں تو سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ ان کا نفع نقصان وابستہ ہوتا ہے یا جن کی Nuisance Value ہو، اجنبی اور حیا سے عاری لگتے ہیں۔

پاکستانی سیاست، قومی مفاد کے تناظر میں

میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو بہر حال عملی طور پر پاکستان کا حصہ سمجھتا ہوں، اس لیے جب میں پاکستان کی بات کرتا ہوں، اس میں یہ علاقے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ملک بھر کے سیاست دان ایک جیسے ہیں۔ان کی پرورش اور آبیاری غیر جمہوری اور ایک لحاظ سے ماورا آئینی ڈسپلن کے، طویل عرصہ پر محیط فوجی حکومتوں کے دوران ہوتی رہی ہے۔پاکستان میں سیاست چوں کہ خان وادوں، جاگیرداروں، نوابوں، وڈیروں، پیروں، خانقاہوں، برادریوں وغیرہ کی ملکیت ہے اس لیے عام لوگ سیاسی ورکر کے طور پر پروان نہیں چڑھ سکے۔ان میں خوئے تسلیم اور خوئے غلامی رچی بسی ہے، اگر کہیں بغاوت کی چنگاری ہے بھی وہ بھی کسی نسبت سے ہی رہی ہے۔مرحوم ذوالفقار علی یقینا ایک Exception تھے لیکن ان پر بھی سیاسی آمریت کا غلبہ طاری تھا جو ان کو خاندانی وڈیرگی اور جنرل ایوب کی آمریت کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تربیت میں ملا تھا جو 1973 کے آئین کو متفقہ طور منظور کرنے کے فوراً بعد آمرانہ ترامیم اور سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹری اور پھر 1977 کے انتخابات میں بلاشرکت غیرے اختیار حاصل کرنے کی سرگرمیوں سے واضح ہے۔اگر وہ خالص جمہوری سیاسی ورکر ہوتے تو ان میں لچک ہوتی، جس کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف پاکستان، بلکہ عالم اسلام ایک متحرک لیڈر سے محروم ہوگیا۔

اس کے برعکس میاں محمد نواز شریف بھی ویسے ہی گملے میں پروان چڑھے لیکن اپنے اندر لچک کی وجہ سے ضیاالحق مرحوم سے زیادہ سخت گیر فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کی چھری سے نکلے اور اس سے پہلے ویسے ہی حالات سے دوچار ہونے کے باوجود بچ بھی نکلے اور تین بار وزیر اعظم بھی بنے۔کاروباری تربیت کے پس منظر میں ’’سارا جاتے دیکھیو، آدھا دیجیو بانٹ‘‘ والی لچک نے ان کو سیاست میں پروان چڑھنے اور چڑھتے رہنے میں بڑی مدد دی ہے لیکن اپنا طرزِ حکمرانی آمرانہ ہے۔اگر خالصتاً

فوجی آمریت کی تربیت سے جڑے رہتے تو آج تک ہم نے نہ جانے ان کی کتنی برسیاں منائی ہوتیں۔ان کے علاوہ بھی سیاسی کردار ہیں لیکن ان کا خصوصی طور ذکر کیا ہے کہ ان کی چھاپ پاکستانی سیاست اور حکومت میں بہت عرصہ سے گونجتی چلی آرہی ہے جن میں سیاست کی چنگاری سلگتی نظر آتی ہے۔

میاں نواز شریف کے بارے میں عمومی تاثر ہے کہ ان کے فوج کے ساتھ تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے بلکہ پنجابی زبان میں لوگ کہتے ہیں کہ فوج کے ساتھ پنگا لیتے رہے اور حوالے کے طور پر جنرل آصف نواز، جنرل کاکڑ اور جنرل مشرف کا بالخصوص حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ بظاہر درست محسوس ہوتا ہے لیکن اس کی صورتِ حال اس طرح کی بھی کہی جاسکتی ہے کہ فوجی حکمرانوں نے کبھی جمہوری حکمرانوں کو قبول نہیں کیا۔ یہ معاملہ نواز شریف تک محدود نہیں،، بلکہ ذوالفقار علی بھٹو، محمد خان جونیجو اور بے نظیر بھٹو بھی اس اختلاف کے شکار ہوئے۔ جنرل ضیا اور جنرل مشرف کی بالترتیب 1980 اور 2001 کی مہم جوئی نے پاکستان کو جنگجو بنا دینے کے بعد ان کو مسمار کر کے پاکستان کو جہنم زار بنا دیا جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں اور جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔لیکن فوج میں ہی جنرل جہانگیر کرامت جیسے باوقار جنرل بھی تھے جنھوں نے جمہوری حکمران کی کمان مانتے ہوئے استعفیٰ بھی دے دیا۔اسی طرح جنرل کیانی کے بعد جنرل راحیل شریف اور جنرل باجوہ نے سیاست دانوں اور جمہوری حکمرانوں کو تسلیم کر کے براہِ راست مداخلت سے کنارہ کشی اختیار کی۔اب یہ جمہوری حکمرانوں سے اپنی بات منوا لیتے ہیں، مجبور کر کے نکال نہیں دیتے۔ میں پُرامید ہوں کہ اب انہوں نے Co-exist کرنا سیکھ لیا ہے۔

فوجی آمریت ملک میں کم وبیش چونتیس سال تک محیط رہی اور ایک ہی طرح کے لوگ بلاشرکت غیرے فوجی حکومتوں کے دور میں چہرے بدل بدل کر آتے رہے لیکن اپنی تربیت کی وجہ سے ان میں Sub-ordination Initiative کا عنصر غالب رہا جو فوجی تربیت کا خاصہ ہے، جس کے بغیر فوج کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔ان سیاست دانوں میں لیڈر شپ کو الٹی اس وجہ سے پروان نہیں چڑھ سکی کہ جس تربیت گاہ سے وہ آئے ہیں وہاں سیاست میں ٹریننگ نہیں ہوتی بلکہ ایک مخصوص شعبہ کے ڈسپلنڈ لوگوں میں ایک دوسرے کے تابع رہ کر آگے بڑھنے اور فتح کرنے کا جذبہ پیدا کیا جاتا۔ جبکہ سیاست میں ایک دوسرے کو برداشت کرنا، Acomodate کرنا، مکالمہ کرنا، کہیں دو قدم پیچھے ہٹنا کہیں

358

آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا لازمی ہے۔ پھر جو غیر فوجی حکومت کا قلیل عرصہ میسر بھی آتا رہا اس میں بھی فوجی کھٹکا اور اثر اندازی موجود رہی جس وجہ سے Initiative کا فقدان رہا۔

حکومت وقت کی مخالف سیاسی جماعتوں کا بالواسطہ اور بلا واسطہ تعلق فوج کے ساتھ رہا جو حکومت وقت کے خلاف تحریک چلا کر فوج کو حکومت برطرف کرنے پر اکساتے رہے، جبکہ فوجی قبضہ سے بچنے کے لیے حکومت وقت کی حالات پر گرفت ڈھیلی اور فوج کو خوش کرنے کے لیے رعایتیں دیتی رہی، جس کے نتیجے میں فوجی حکمران اور سیاست دان ملک کو دو دو ہاتھوں سے لوٹتے رہے اس کا ثبوت ان کے سوئس اور پانامہ بینک اکاؤنٹس لندن، امریکہ، دبئی میں ان کے اثاثے ہیں جو قومی دولت سے کئی گنا زیادہ ہیں۔لندن کے ایک صحافی کی رپورٹ کے مطابق صرف جنرل مشرف اور سب سے زیادہ شریف اور سادہ سمجھے جانے والے جنرل کیانی کے بھی ملین ڈالرز کے اثاثے ہیں جو بھائی کے ذریعہ مصروفِ عمل رہے۔اس کے علاوہ پاکستان بھر میں ان کی ٹھاٹھ باٹھ بھی دیدنی ہے۔سیاست دانوں، وڈیروں، جاگیرداروں کی تو بات ہی کیا ہے۔

فوج اور سیاسی لیڈر شپ میں بداعتمادی کی فضا قائم رہی جس وجہ سے دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔فوج کا اس طرح کہ وہ خالصتاً فوجی تربیت اور حرب وضرب پر یکسو ہونے کی بجائے ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں بھی الجھی رہی جبکہ سیاست دان خالصتاً سیاسی اور جمہوری اصولوں پر کام کرنے کی بجائے مصلحت، مصالحت اور سمجھوتوں کے تحت وقت گزارتے رہے۔جس کی سزا قوم نے مشرقی پاکستان کے سقوط اور کارگل کی مہم جوئی کی صورت میں بھگتی اور اب سفارتی تنہائی کی وجہ سے۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے پر الزام شفٹ کر کے پاکستان کو دنیا بھر میں جگ ہنسائی کا باعث بنایا۔1965 میں اگر پوری قوم، بالخصوص پنجاب اور اس میں سے بھی لاہور، متحرک نہ ہوا ہوتا تو خاکم بدہن، ہندوستانی فوج کا ''لاہور جم خانہ'' میں جشن منانے کا مکروہ عزم بھی کامیاب ہوسکتا تھا۔

اس تمام تر سیاسی وفوجی آنکھ مچولی کے باوجود بھی، فوج اپنی پیشہ وارانہ استطاعت بڑھاتی رہی۔بھٹو صاحب کے ایٹم بم بنانے کے منصوبے کی تکمیل کی، ہندوستان کو Contain اور قوم کا مورال بحال رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اگر فوج افغانستان میں پہلے روسیوں کو اور پھر روسیوں کو نکالنے والوں کے تعاقب میں ملوث نہ ہوتی، تو پاکستان یقیناً اسرائیل سے زیادہ مضبوط اور کسی بھی خوش حال

ملک سے زیادہ خوش حال ہوتا۔ یہ دونوں فیصلے فوجی حکمرانوں، ضیاالحق اور جنرل مشرف نے یکے بعد دیگرے کیے تھے۔لیکن اس سے پاکستانی فوج نے یقیناً بہت کچھ سیکھا۔

یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان کے حق میں آبی وسائل کی فروخت، سقوط ڈھاکہ، سقوط سیاچن، ہزیمت کارگل، فاٹا اور وزیرستان پر دہشت گردوں کا قبضہ، ہیروئن، کلاشنکوف کلچر، کراچی میں قتل وغارت بھی فوجی حکومتوں کے زمانے میں ہی ہوئی۔ پاکستان میں اقتصادی اور انڈسٹریل ترقی سوائے جنرل ایوب کے کسی فوجی عہد میں نہیں ہوئی۔ جس نے اپنے بچوں کی حکومت میں مداخلت سے پہلے سب کچھ دیانتداری سے کیا جبکہ ضیاالحق اور جنرل مشرف نے امریکی حکم اور غلامی میں اپنے اقتدار کو ہی طول دینے کی کوشش کی اور ڈالروں کی بارش سے مجاہدین کے نام پر دہشت گردوں کی پرورش ہوتی رہی جس کی سزا ملک مسلسل بھگت رہا ہے۔ سیاست دانوں اور مولویوں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کیا گیا جس سے ملک کی سیاست جدید خطوط پر ارتقا پذیر نہیں ہوسکی۔

یہ سب فیصلے خالصتاً فوجی فتوحات کی تربیت کے پس منظر میں کیے گئے تھے، سیاسی یا سفارتی حکمت علمی سے نہیں جو فوجی ٹریننگ سے نہیں بلکہ مسلسل سیاسی عمل سے گزرنے کے بعد ہی ممکن ہوسکتے ہیں۔ دشمن کو پہچاننا، اس پر نظر رکھنا اور مقابلے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا ضروری ہے لیکن دشمنی کو محدود، کم اور ختم کرنے کی حکمت عملی سیاسی قیادت ہی تیار کرسکتی ہے جس میں اداروں کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے حکام اس میں حتمی حیثیت نہیں رکھتے کیوں کہ وہ اپنے پروٹوکول کے تحت ایک خاص زاویہ نگاہ رکھتے ہیں اور ہر عمل کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ عالمی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سفارتی حکمت عملی بھی بدلنی پڑتی ہے جس کا ادراک سیاسی قیادت کو کسی سرکاری افسر کے مقابلے میں زیادہ ہوسکتا ہے۔ ہماری ہندوستان پالیسی اس کا شکار ہے جس میں کوئی Opening نہیں ہو رہی۔

فوجی حکومت میں صرف جنرل مشرف نے ہندوستان کے ساتھ Opening کی جس وجہ سے کچھ پیش رفت بھی ہوئی۔ ایل۔ او سی۔ پر بس سروس اور پرمٹ پر بلا پاسپورٹ سفر کوئی معمولی بات نہیں نہ ہی مقامی سطح پر بدوں کسٹم ڈیوٹی تجارت معمولی بات ہے۔ اس سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی جس نے 95 ہزار جنگی قیدی مکمل طور اور 1999 میں نواز شریف نے کارگل کی

358

پہاڑیوں میں محصور فوجیوں کو Safe passage دلایا، مکمل ایٹمی جنگ سے برصغیر کو بچایا۔ سیاست دان اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے راستے میں فوج حائل رہتی ہے۔ ممکن ہے سیاسی حکومتوں کے دوران ایسا ہوتا ہو لیکن ہندوستان کے ساتھ مذاکرات کے ذریعہ مفاہمت اور چند مسائل کا حل بھی فوجی حکومت کے دوران ہوا جیسے کہ ایوب خان کے زمانے سندھ طاس کا معاہدہ، جنرل مشرف کے زمانے میں شدید جنگی کیفیت طاری ہونے کے باوجود دونوں ملک انتہائی جذباتی مسئلہ کشمیر پر Out of Box حل کے قریب پہنچ چکے تھے جب مشرف اندرون ملک سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ اس کے باوجود کشمیر کے دونوں حصوں میں آمدورفت، تجارت۔ طلباء کا پاکستانی یونیورسٹیوں میں داخلہ، پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین اور مجاہدین کی واپسی وغیرہ ایسے اقدامات ہیں جس کا کریڈٹ یقیناً فوجی حکومت کو جاتا ہے۔ میرے خیال میں حکومت کرنے والے، بھلے وہ فوجی ہوں یا سیاست دان، ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے فائدے نقصان کا اندازہ زیادہ بہتر لگا سکتے ہیں یا کریڈٹ لینے کے چکر میں ایسا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ان کے بعد عمران خان لیڈرشپ کوالٹی کے ساتھ سامنے آئے جن کے پس منظر میں کرکٹ کی عالمگیر لیڈرشپ تھی۔ لیکن وہ لیڈرشپ بھی آمرانہ طرزِ فکر کی حامل ہے، جو ان کے عام ورکرز سے دوری اور چند لوگوں میں گھرے رہنے سے عیاں ہے۔ اس کے شوکت خانم ہسپتال اور یونیورسٹی کے پروجیکٹس قابل رشک لیکن اقتدار کی ہوس قابل افسوس ہے جس نے ملک میں حکومت وقت کو ترقی کرنے کے لیے مجبور کرنے کی بجائے، اس کو ہٹانے کی انتشاری اور احتجاجی سیاست نے نہ اس کا وقار بڑھنے دیا اور نہ ہی حکومت کو کام کرنے پر مجبور کیا۔ ان کا لب ولہجہ نوجوانوں میں Fascism (فسطائیت) پھیلا رہا ہے۔ اقتدار کے لیے عام اور روایتی سیاست دانوں کی طرح حریفوں اور حلیفوں کو بدلنے میں کوئی معیار نہیں رکھا۔ یہ ایک قومی نقصان ہے۔ حکومت کو ہٹانے اور خود اس پر براجمان ہونے کا اندازہ ان کے ان دو بیانات سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے دھرنوں کے دوران استعمال کیے تھے، ''ایمپائر کی انگلی اٹھنے والی ہے'' یعنی فوج مداخلت کرے اور ''میاں جی جانڑ دیو ساڈی باری آنڑ دیو'' یعنی ان کا مقصد صرف حکومت پر قبضہ حاصل کرنا ہے۔ مالی طور ایک دیانتدار قیادت اس طرح اپنی انا اور آمرانہ سوچ کی اسیر ہوگئی۔ ان کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے

دھرنے کے دوران کہا تھا کہ ''میں نیا پاکستان اس لیے بنانا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرلوں۔'' اس کے باوجود عمران خان متبادل قیادت کے طور پر ایک حقیقت ہے۔

مولانا فضل الرحمان جمعیت الاسلام کے سربراہ پاکستانی سیاست کے تیسرے بڑے کھلاڑی ہیں جن کے لیے اقتدار میں رہنا ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ فوجی حکومت ہو یا متضاد خیال سیاسی جماعتوں کی حکومتیں، مولانا کسی کے ساتھ بھی تعاون کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں اور بغیر وقت ضائع کیے ان کی جھولی میں ایسے گرتے ہیں کہ جیسے بنے ہی اس کے لیے ہیں، اور لینے والے بھی ان کو لینے کے لیے اتنے ہی بیتاب ہوتے ہیں۔ قوم کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر حکومتوں کو بلیک میل کر کے اعلیٰ آئینی اداروں پر قبضہ کر کے ان کو اپنی اور اپنی جماعت کی ترقی اور حکومت کو زچ کر کے اپنے مطلب براری میں مگن رہتے ہیں۔ کشمیر کمیٹی اور اسلامی نظریاتی کونسل پر قبضہ کر کے حکومت کی شہ رگ پر ہاتھ رکھا ہے جس سے ان اداروں کا وقار مجروح اور ان کی جماعت وسعت پذیر ہو رہی ہے جبکہ حکومتیں ان کے تعاون سے اپنا وقت پورا کرنے میں عافیت سمجھتی ہیں، مولانا جو چاہیں کریں، ادارے جائیں بھاڑ میں۔

جماعت اسلامی پاکستان کی واحد منظم اور سیاسی طور طریقوں میں جمہوری جماعت ہے لیکن پاکستانی جاگیرداری، سرمایہ داری اور وڈیرہ شاہی ماحول میں پنپ نہیں سکی۔ اس وجہ سے ریاستی فلاح و بہبود اور طرز حکمرانی پر اپنے نظریہ پر جم کر کاربند نہیں رہی۔ وقتی مصلحتوں کے تحت حکومت وقت کی حلیف اور حریف بنتی رہی جبکہ اپنے نظریہ کے تسلسل میں کوشاں نہ رہنے کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی اس وجہ سے اس کا ووٹ بینک نہیں بن سکا۔ اگر یہ اقتدار کی خواہش کو وقتی طور بالائے طاق رکھ کر اپنے معاشی اور اقتصادی نظام کے لیے تحریک چلاتی تو پاکستان کے 5 فیصد سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بہالے جاتی کیوں کہ 95% فیصد لوگ ان کے خلاف ہیں جن کو منظم کرنے کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی گئی جو صرف جماعت اسلامی کر سکتی ہے۔ جب تک جماعت اسلامی ایسا نہیں کرے گی، اس کے نظام کے نفاذ کا پروگرام ممکن نہیں ہوسکتا۔ حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں کندھا دے سکتی ہے لیکن خود حکومت نہیں بنا سکتی جس کے باعث اس کا عظیم انقلابی نظام روبہ عمل نہیں آسکتا۔

پاکستان کی علاقائی جماعتوں میں سے ایم کیوایم سندھ کے شہری اور نیشنل عوامی پارٹی سرحد کے پشتون علاقوں پر محیط نسلی اور لسانی گروپ ہیں جن کی وجہ سے Polarisation ہوگئی ہے۔ ان کا طبعی میلان پاکستان مخالف نہیں لیکن ہندوستان نواز ضرور ہے جو پاکستان کے 90 فیصد لوگوں کو قابل قبول نہیں ہے، وگرنہ ان میں پڑھے لکھے، بہادر، بے خوف متوسط طبقے کے لوگ موجود ہیں جو اگر قومی دھارے میں ہی رہیں تو یقیناً وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جس کی جماعت اسلامی دعوے دار ہے۔

ایم کیوایم کی وجہ سے ملک میں انتشار کی سیاست پروان چڑھی ہے، جس کو جنرل مشرف نے بھی اپنی Constituency کا درجہ دیا۔ ایم کیوایم کا ضیاالحق کے زمانہ سے آج تک پاکستان میں سندھ کے شہری علاقوں میں دبدبہ رہا اور حکومت میں بھی رہے، لیکن جہاں جہاں ان کی لیڈرشپ کا غلبہ ہے، وہاں بدامنی، انتشار، لاقانونیت، قتل وغارت گری، اور خوف و ہراس کی کیفیت طاری رہی ہے۔ ان کی حب الوطنی شک وشبہ سے بالاتر تھی، لیکن ان کے اقدامات حب الوطنی سے عاری ہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی کے ہندوستان نواز جذبات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں لیکن یہ ان کی لیڈرشپ کے ہندوستان کے ساتھ ذاتی تعلقات کی وجہ سے ہیں، ان کے پیروکار اس کے پابند نہیں جس کا ثبوت صوبہ سرحد میں 1947 کا ریفرنڈم ہے۔ ان لوگوں کو پاکستان بننے کے بعد بھی شک کی نظر سے دیکھا گیا، ان کو اپنایا نہیں گیا جس کی وجہ سے یہ دور ہوتے رہے وگرنہ پشتون ایک غیرت مند قوم ہے جو قومی دھارے سے الگ نہیں ہوسکتی تھی۔ غیر ملکیوں نے پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنے کے لیے ان کی لیڈرشپ کا بھرپور استعمال کیا جس وجہ سے افغانستان کے حوالہ سے ان کا نرم گوشہ جو بالآخر ہندوستان کے لیے فائدہ بخش اور پاکستان کی خوش حالی کے لیے کالا باغ ڈیم کی جنون کی حد تک مخالفت پاکستان کی اقتصادی اور معاشی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مرحوم ضیاالحق نے اپنے دور کو طول دینے کے لیے امریکہ کی ڈالروں کی مدد سے لسانیت، فرقہ پرستی، مذہبی جنونیت علاقہ پرستی کا ایسا بیج بویا ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتا۔ جنرل مشرف نے ان جنونیوں کو ختم کرنے کے لیے امریکہ کے کہنے پر ان کو متبادل روزگار دیئے بغیر تہہ وتیغ کرنے کی کوشش کی جس کے ردِعمل میں نئے روزگار کی تلاش میں یہ لوگ جہادی تنظیموں کے نام سے کشمیر کی جنگ آزادی میں کود پڑے جہاں نہتے کشمیری ہندوستانی فوج کے لیے تر لقمہ بن گئے اور اندرون پاکستان

بھی جہاد کے نام پر دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا جس کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، جو محض روزگار کا ایک آسان ذریعہ ہے اور پاکستانی سیاست میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے ایسی Nuisance Value پیدا کر رہی ہے کہ کوئی بھی حکومت ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جنرل ضیا اور مشرف نے عملی طور امریکہ کے لیے Mercenarines تیار کیے جواب ملک میں ضرب عضب، ردالفساد کی وجہ سے فرار ہو کر بالخصوص خلیجی دنیا میں استعمال ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے پاکستان تنہا ہوتا جا رہا ہے اور ہر بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پاکستانی پاسپورٹ والے کو دہشت گرد ہی سمجھا جاتا ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ یہ اس لسٹ میں نہیں ہے۔

سیاسی خانوادوں نے آپس میں شادی بیاہ کے ذریعہ سیاسی رشتے قائم کر لیے ہیں۔ اپنی نسلوں کو اپنا جانشین مقرر کر کے اسمبلیوں، بلدیاتی اداروں اور بیوروکریسی میں Establish کر لیا ہے۔ حکومت جس جماعت کی بھی ہو، ایک دوسرے کے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں۔ آئین کو اس طرز پر بنالیا ہے کہ خاندانوں کی سیاسی جماعتوں پر اجارہ داری اور ان کے سربراہ کو کسی اختلاف کرنے والے کو جماعت اور نمائندہ عہدے سے نکالنے کے لیے ان کی بات حرفِ آخر ہو گئی ہے۔ یہ خاندانی سیاسی جماعتوں کی آئین کے تحت جمہوریت کے نام پر آمریت بن گئی ہے۔ اس کو کون پاٹے گا؟ آئینی طور محفوظ سیاسی آمریت میں پرورش پانے والے قوم کی کیا خدمت یا نمائندگی کریں گے؟ اور مستحکم سیاست اور سفارت کے بغیر بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا Image کیا بن سکے گا؟

سیاست دانوں اور فوجیوں کا ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنا بھی المیہ ہے۔ فوج قوم کی ہے اور ملک کی ہے، اس پر شک کرنا یا اس کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا یا فوج کا سیاست دانوں کی تحقیر کرنا اور ان کو چور سمجھنا قومی وقار اور ملکی سلامتی پر حملہ ہے۔ اقتدار سے باہر کے سیاست دانوں کا فوج کو حکومت وقت کو ہٹانے پر اکسانا اور حکومت کرنے والے سیاست دانوں کی فوج پر الزام تراشی بھی ہمارا سیاسی کلچر بن گیا ہے۔ ایجنسیوں کی پیاز کی طرح پرت در پرت تہیں ہیں، کسے معلوم کس پرت کا کس کے ساتھ تعلق ہے اور اس کو کاٹنے کے لیے کون سی پرت لگی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی بیل منڈے نہیں چڑھتی۔ ان سب کا ایک Page، ایک پالیسی پر ہونے سے ہی ملکی سلامتی، سیاسی استحکام اور اقتصادی ترقی پروان چڑھ سکتی ہے۔ پاکستانی فوج اور ایجنسیوں کو ملکی سیاست سے نکالا نہیں

جا سکتا نہ وہ نکلنا چاہتی ہیں۔ مناسب ہے کہ یہ ادارے لیڈر گھڑنے کی بجائے منتخب لوگوں کو ہی ملکی مفاد میں استعمال کریں، اپنے کارندے سیاست میں داخل نہ کریں، اس سے لیڈر شپ بھی پروان چڑھے گی اور فوج بھی بدنام نہیں ہوگی۔

کیا کیا جانا چاہیے؟

اداروں کو اپنا اپنا کام اپنے اپنے مینڈیٹ کے اندر کرنے سے ہی ملک میں خوشحالی آئے گی اور اس کا بین الاقوامی سطح پر وقار بحال ہوگا۔ فوج کو حکومتوں کو ڈکٹیٹ کرنے کی عادت ترک کرنا پڑے گی، سیاسی حکومتوں کو داخلی، خارجی اور دفاعی پالیسی بناتے وقت فوج کو اعتماد میں لینے سے ہی ملک میں اندرونی استحکام، خوش حالی اور بیرونی دفاع اور وقار بحال ہوگا۔ نیشنل ایکشن پلان اس سلسلے کی ایک کلاسیکل مثال ہے۔ سب نے مل کر بنایا اور اس کے فوائد سے پوری قوم مستفید ہو رہی ہے۔ اسی طرح کا پلان جاگیرداری، موروثی سیاست کرنے والوں، خانقاہی نظام کے ٹھیکیداروں، ٹیکس چوروں، منافع خوروں، قومی مفاد کے پراجیکٹس کے راستے میں حائل گروہوں، نالائقوں اور نااہلوں کے خلاف بنا کر اسی شدت اور مستعدی سے اس کے نفاذ کی ضرورت ہے۔ اس میں عدلیہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

ہمسایہ ملکوں سے تعلقات کا بدلتی ہوئی دنیا کے حالات کے تناظر میں قومی مفادات کو نظر انداز کیے بغیر از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جن میں ہندوستان، ایران، افغانستان سعودیہ اور گلف کی ریاستیں اہم ترین ہیں۔ اپنے معاملات میں ان کی مداخلت اور ان کے معاملات میں اپنی مداخلت کو بند کرنے کی پالیسی پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے، چین کے ساتھ تعلقات قابل رشک، لیکن سارے انڈے ایک باسکٹ میں رکھنا بھی عقل مندی نہیں۔ ملک کے اندر لوگوں کو قومی معاملات میں ساتھ چلانے کے لیے بنیادی جمہوریتوں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری لیڈر شپ بنانے کی نرسری کا کام کریں گے۔ ملک کی سیاسی فضا کو مذہبی جنونیت، علاقہ اور فرقہ پرستی سے پاک کر کے خالصتاً تعمیر و ترقی کے اور قومی ترقی کے راستوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے، اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اقتصادی منصوبہ بندی اور احتساب کی ضرورت ہے جس کا بے ضرر طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس موجود وسائل کے ذرائع دریافت کر کے ان کے جائز ہونے کی صورت میں اثاثوں کو تحفظ اور

ناجائز ہونے کی صورت میں سرنڈر کروائے جائیں۔ جنرل ضیا اور جنرل مشرف کی مہم جوئیوں کو پاکستان کی ابتر اندرونی اور بیرونی سفارت کاری کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ یہ درست ہے مگر یہ مہرے کے طور پر استعمال ہوئے، بظاہر دونوں کے عقائد اور سوچ میں کوئی یکسانیت نہیں تھی اور اپنی اپنی فکر میں انتہاپسند تھے لیکن ملک میں کوئی مستند قومی پالیسی اور سیاسی سوچ نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں مہرے تھے، اس کے معمار اور ڈائریکٹر نہیں تھے۔ اگر مشرف 80 کی دہائی میں ہوتے تو اپنے ڈائریکٹر کے کہنے پر وہی کچھ کرتے جو ضیا نے کیا اور اگر 2000 کی دہائی میں ضیا ہوتے تو وہ بھی وہی کچھ کرتے جو مشرف نے کیا۔ مستند قومی پالیسی، مستند لیڈرشپ ہی بنا سکتی ہے، سرکاری ملازم نہیں، وہ صرف چلا سکتے ہیں۔

سفارت کاری کو صرف قومی مفاد اور ملکی سیکورٹی کے نظریہ پر مضبوط اور استوار کیا جائے۔

تعلیم کا نظام تربیت سے مربوط کیا جائے۔ حکومتی اداروں کو چلانے کے لیے شفاف میرٹ پر بھرتی کو ترویج دیا جائے جن کے اندر خود احتسابی کا نظام خودکار طریقہ پر کام کرتا رہے۔ ملک میں انقلابی تبدیلی کے اصول کی بجائے بتدریج اصلاح کا اصول اپنایا جائے۔ احتساب کا نظام بھی قومی ایکشن پلان سے منسلک کیا جائے جس کے تحت بلا امتیاز سب جواب دہ ہوں جس کی ابتدا سیاسی حکمرانوں، فوجی جرنیلوں اور سول بیوروکریسی سے کی جائے جس میں بھی صرف ان کے ذرائع آمدن وسائل اور اثاثہ جات میں تفاوت کی صورت میں ناجائز دولت بحق ریاست ضبط کی جائے۔ سرکاری خرچ پر بلا ضرورت اخراجات، پروٹوکول اور سیکورٹی کو بند کیا جائے۔

میرا ایمان ہے کہ جب تک پاکستان میں سیاسی استحکام، اقتصادی ترقی اور سفارتی مستعدی نہیں ہوگی، پاکستان کی بقا اور سلامتی داؤ پر لگی رہے گی۔ جس کی ذمہ داری سیاست دانوں اور فوج پر یکساں ہوگی۔

اس سیاسی پس منظر میں کشمیر کے مسئلہ پر پیش رفت تو کیا پسپائی بھی اسی سیاسی چپقلش، عدم استحکام، اقتصادی خستہ حالی اور سفارتی کمزوری کا باعث بنتی رہی۔ ہر دور میں حکومت وقت کو اس کے مخالفین اس پر کوئی پیش رفت نہیں کرنے دیتے نہ ہی اس کے حل ہونے میں کوئی قومی منصوبہ بندی کرتے ہیں تا کہ ہندوستان کی طرح اس مسئلے پر ایک ٹھوس قومی پالیسی بنا کر اس پر چٹان کی طرح ڈٹ جائیں۔ ہندوستان کے ساتھ تعلقات ہند، چین اور چین تائیوان، ہانگ کانگ کی طرز پر استوار کرنے

کے بغیر کشمیر پر کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ اس کا ادراک سب کو کرنا چاہیے۔ جنرل مشرف کے زمانے میں پیش رفت کو سیاست دانوں نے روکا اور نواز شریف کے زمانے میں پیش رفت کے امکان کو فوج اور مخالف سیاسی جماعتیں آگے نہیں بڑھنے دے رہے۔ اس مسئلے کو ایک دوسرے کو بلیک میل کرنے اور قوم کے جذبات کو Exploit کرنے کے لیے چپ کے طور استعمال کیا جا رہا ہے جبکہ کشمیریوں کی پاکستان کے نام پر نسل کشی ہو رہی ہے۔

آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان مرکزی سیاست کا پرتو ہیں۔ یہاں تقریباً سارے سیاست دان مرکزی خوشامد اور چاپلوسی میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کے مقابلے میں لگے رہتے ہیں۔ کشمیر کا ایشو چٹنی کے طور استعمال ہوتا ہے۔ جو حل ہونے کی صورت میں سیاست دان الزام تراشی سے محروم ہو جائیں گے، اس لیے اس کے راستے میں حائل ہیں۔ اس میں پیش پیش کشمیری سیاست دان ہیں۔

حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ کشمیر کے جو حصے اس کے پاس ہیں ان کو مقبوضہ حصوں کے لیے قابل رشک بنائیں اور اگر کبھی استصواب رائے کا وقت آ گیا کم از کم یہ حصے اس وقت پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ قوم بلوغت سے نکل کر پیری میں پہنچ چکی ہے۔ کچھ تو شرم کریں کچھ تو حیا کریں۔ اس ملک پر رحم کریں جس نے آپ کی اور میری نسلوں کو پناہ دینی ہے۔ اگر سیاست کی دھار اور سیاست دان ایسے ہی رہے تو ہمارے انجام کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

سینٹ کے ٹکٹ سے اسلامی نظریاتی کونسل کی ممبر شپ تک

2014 میں پاکستان سینٹ کی خالی ہونے والی نشستوں میں سے پنجاب کی ایک نشست پر میں نے بھی پاکستان مسلم لیگ کے ٹکٹ کی خاطر درخواست دی جس کے لیے میں نے راولپنڈی میں اپنا ووٹ درج کرایا۔ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی دفتر اسلام آباد میں راجہ ظفر الحق کی قیادت میں ہوا جس میں گورنر سرحد مہتاب عباسی، وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف، پرویز رشید (جو خود بھی ٹکٹ کے امیدوار تھے) اس کے علاوہ چند اور چیدہ چیدہ پرانے لیڈرز تھے۔ ایک ہال میں ہر صوبے سے ٹکٹوں کے امیدوار کو اکھٹے بیٹھا کر انٹرویو لیا گیا۔

میں نے بورڈ کو برملا کہا کہ مسلم لیگ کے پرانے ورکرز کے مقابلے میں بہت جونیئر ہوں

لیکن تجربہ، استحقاق، آئین، قانون، برصغیر کی تاریخ، کشمیر ایشو کے حوالے اور آزاد کشمیر کی براہ راست نمائندگی نہ ہونے کی بنا پر میرا استحقاق فائق ہے کیوں کہ میں آزاد کشمیر میں مسلم لیگ ن کے قیام کے وقت نواز شریف کی دعوت پر شامل ہونے والا پہلا شخص ہوں، جس نے مسلم لیگ ن آزاد کشمیر کے 2011 کا الیکشن منشور تیار کرنے کے علاوہ کشمیر پاکستان تعلقات پر سیکڑوں کالم لکھے ہیں۔ گورنر سرحد سردار مہتاب عباسی اور راجہ ظفر الحق نے ساری بات توجہ سے سنی، البتہ شہباز شریف نے انتہائی بے رخی اور لا تعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے توجہ کسی اور طرف موڑ دی۔ یہ چوں کہ فیصلہ کن حیثیت کے حامل شخص تھے جن کے طرزِ عمل سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ انٹرویو کی کارروائی رسمی ہے اور جن کو ٹکٹ دینا ہے، ان کا فیصلہ ہو چکا ہے جس کا علم شہباز شریف کو ہے، اسی لیے اس نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔

اس کے بعد سب ٹکٹ گزاروں کی ملاقات میاں نواز شریف صاحب سے پنجاب ہاؤس میں کرائی گئی جو مین ہال کے دروازے پر کھڑے ہو کر بادشاہوں کی طرح ہر ایک سے ہاتھ ملاتے رہے اور لوگوں کو ہال کی طرف لے جایا جاتا رہا جہاں چائے سے خاطر تواضع کی گئی۔ ہال میں کچھ جانے پہچانے لوگوں کو چہکتے مہکتے اِدھر اُدھر پھرتیاں مارتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یقیناً یہی لوگ مستقبل کے سینیٹر ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہی لوگ سینیٹر منتخب بھی ہوئے۔

میرے خیال میں ہر پارٹی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کارروائی رسمی ہوتی ہے۔ فیصلہ خاندانی مفادات کی روشنی میں پہلے سے ہی ہوا ہوتا ہے۔ اشک شوئی کے لیے ایک پراسس سے گزارا جاتا ہے۔ بہر حال میں نے ایک ضرورت کی ابتدا کی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی وقت ایسا ضرور ہوگا کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کی پارلیمنٹ کے دونوں ہاؤسز میں حکومت پاکستان کو نمائندگی دینا پڑے گی کیوں کہ یہ کلونیل سسٹم اب نہیں چل سکتا۔

اس مشق کے کچھ عرصہ بعد میں کشمیر چلا گیا جہاں مجھے طارق مسعود صاحب سابق ایڈیشنل چیف سیکریٹری کا بیرسٹر ظفر اللہ معاون خصوصی وزیر اعظم پاکستان کے حوالہ سے فون موصول ہوا کہ حکومت پاکستان مجھے پاکستانی اسلامی نظریاتی کونسل کا ممبر مقرر کرنا چاہتی ہے جس کے لیے میری رضامندی درکار ہے۔ اس سے قبل پاکستان ویج بورڈ کا چیئرمین بنانے کے لیے پرویز رشید صاحب وفاقی وزیر قانون نے رضامندی دریافت کی تھی جس سے میں نے معذرت کی تھی۔ یہ واقعہ سینٹ کی

مشن سے پہلے کا تھا۔ تاہم اسلامی نظریاتی کونسل چوں کہ ایک آئینی ادارہ ہے جس میں ملک کے نامور علما اور بین الاقوامی شہرت کے سکالرز ممبر رہ چکے تھے، جو ایک علمی اور دینی سرگرمیوں کا مرکز ہے، میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس رضامندی کی ایک خصوصی وجہ یہ تھی کہ آزاد کشمیر سے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار آزاد کشمیر سروس کے کسی شخص کو منتخب کیا جا رہا تھا۔ میں نے آزاد کشمیر کے مستقبل میں Opening کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھا۔ یہ معاملہ نہ معلوم کیوں لمبے عرصے تک لٹکا رہا۔ میں اس دوران امریکہ چلا گیا جہاں مجھے اطلاع ملی کہ اس ادارے میں ممبر کی حیثیت سے میری تقرری ہو گئی ہے امریکہ سے واپسی پر میں نے بطور ممبر جوائن کیا۔ اس کا ممبر قومی اسمبلی کے ممبر کے ہم پلہ ہوتا ہے اور تنخواہ مراعات وہی ملتی ہیں۔ میرے خیال میں راجہ ظفر الحق صاحب نے حکومت کو ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہوگا کیوں کہ سینٹ کی ٹکٹ کی کارروائی کے دوران وہی سنجیدہ نظر آتے تھے۔ یہ تقرری عالم دین کی حیثیت سے نہیں بلکہ آئین کے تحت ممبران میں سے دو کا ریٹائرڈ جسٹس ہونا ضروری ہے۔ تقرری سے قبل جب اس کی بھنک آزاد کشمیر میں اخباروں کے ذریعہ لوگوں کو پڑی تو مقامی علماء میں سے ایک صاحب نے یہ تقرری رکوانے اور اپنی کرانے کی کوشش شروع کی جس کے لیے مقامی مسلم لیگی قیادت کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کا علم مجھے تقرری کے کافی عرصہ بعد ہوا۔ بہر حال یہ بات برسبیل تذکرہ ہے۔

پاکستان اسلامی نظریاتی کونسل اسلامی دنیا میں اپنی نوعیت کا اعلیٰ ترین ادارہ ہے جس کا کام پارلیمنٹ آف پاکستان اور صوبائی اسمبلیوں، صدر اور گورنرز کے ریفرنس پر کسی بھی قانون پر یہ رائے دینے کی ذمہ دار ہے کہ مجوزہ بل یا قانون قرآن وسنت کے متصادم تو نہیں جس کی روشنی میں مناسب تجاویز دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ مروجہ قوانین کو کس طریقے سے قرآن وسنت سے ہم آہنگ کیا جائے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو مجموعی اور انفرادی زندگی کو اسلام کے اصولوں کے مطابق گزارنے کے لیے قانون اور انتظامی تجاویز اور مشورے دینا اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو اسلامی اصولوں کی نشاندہی کر کے قانون سازی کے لیے رہنمائی کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ آزاد کشمیر کے آئین کے تحت بھی یہ اختیار اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کو دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں حکومت نے اس کے متصادم ایک کونسل بنائی ہے۔ اس کے چیئرمین چیف جسٹس آزاد

کشمیر ہیں، میں حیران ہوں کہ چیف جسٹس واضح آئینی پوزیشن کی موجودگی میں کس طرح اس عہدے کو قبول کرتے ہیں۔

پاکستان اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین کی کم از کم تعداد 8 اور زیادہ سے زیادہ 20 ہے جس میں دو جج اور کم از کم ایک خاتون کا ہونا ضروری ہے۔ باقی ممبران اسلامی اصولوں اور فلاسفی کے علم پر عبور رکھنے والے یا وہ لوگ ہوں جو اقتصادی، سیاسی، قانونی اور پاکستان کے انتظامی مسائل کا فہم اور ادراک رکھتے ہوں۔ اسلامی اصولوں اور فلسفے کے ماہر وہ لوگ ہونے چاہئیں جو قرآن وسنت کے اصولوں اور فلاسفی میں کم از کم پندرہ سال کی تحقیق وہدایات دینے کا تجربہ رکھتے ہوں۔

ادارے کے سابقہ اراکین اور چیئرمین کی فہرست پر نظر دوڑانے سے پتا چلتا ہے کہ 1988 سے قبل اس معیار کے لوگ اس میں واقعی موجود تھے۔ لیکن جب سے حکومتوں نے یہ ادارہ اور قومی کشمیر کمیٹی کو مولانا فضل الرحمان کی جمعیت علماء اسلام پاکستان کے حوالہ کیا ہے، یہ قومی یا آئینی ادارہ نہیں بلکہ حکومت کو آسانی سے چلانے کے لیے مولانا کی خوشنودی کے تابع ادارہ بنا دیا ہے۔ مولانا سے منسوب کسی ادارے کا وہ لیول نظر نہیں آتا جو ان کے اغراض ومقاصد تھے۔ اپنے منظورِ نظر لوگوں کو بھرتی کر دیا جاتا ہے۔

میرا تجربہ بطور ممبر بہت ہی تلخ اور مایوس کن رہا۔ اس کے چیئرمین مولانا اختر شیرانی قومی اسمبلی میں مولانا فضل الرحمان کی جماعت کے منتخب ممبر ہیں۔ ان کی علمیت، اہلیت، فصاحت وبلاغت پر کوئی شک نہیں لیکن مخصوص ماحول اور صرف ایک فکر کے علم میں پروان چڑھنے کی وجہ سے مجھے ان میں بدلتی ہوئی دنیا میں اسلامی فلاسفی کو ڈھالنے کے لیے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی صلاحیت اور Opening نظر نہیں آئی۔ اپنی جماعت اور سوچ کے پس منظر میں ہر چیز کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ اتحادی حکومت کو دباؤ میں رکھنے کے لیے ایسی بیان بازی اور سفارشات کرتے ہیں جن سے ان کی جماعت کو اتحاد میں بالادستی حاصل رہے۔

میرے ممبر ہوتے ہوئے پنجاب اور خیبر پختون خواہ اسمبلی سے حقوق خواتین بل زیر بحث آئے۔ ان میں کچھ شقیں یقیناً ایسی تھیں جو ہمارے اسلامی شعائر، معاشرتی اور انتظامی ماحول سے متصادم تھیں مثلاً عورتوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ خاوند کے خلاف شکایت کر کے اس کو گھر سے نکلوا سکتی

ہیں۔ پولیس ان کو کڑا پہنا کر زیر نگرانی رکھ سکتی ہے وغیرہ۔ لیکن باقی حقوق ملک میں نافذ العمل قوانین کی صورت میں پہلے سے نافذ موجود تھے۔ ان پر سیر حاصل بحث بھی ہوئی اور طے یہ پایا تھا کہ درج بالا بیہودہ شقوں کے، باقی اسلام سے متصادم نہیں لیکن مولانا نے ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے سارے بل کو قانون وسنت سے متصادم قرار دے کر ملک میں ایک اشتعالی کیفیت پیدا کر دی جس کا فائدہ مولانا فضل الرحمان نے اٹھایا۔ میں نے جب پوچھا کہ اگر یہ بل غیر اسلامی ہیں تو متبادل اسلامی کیا ہے؟ اس پر مشتعل ہو گئے۔

عورت کے چار روپ ہیں، ماں، بہن، بیٹی اور بیوی، بیوی ان میں سے صرف ایک جنس ہے، باقی سب ذوالحرم ہیں۔ ان پر تشدد کا کوئی سوچ اور برداشت نہیں کرتا لیکن کسی اور کی بیٹی اور بہن جو بیوی بنتی ہے، اس کے ساتھ جو سلوک کیا جائے اس کو ناجائز نہیں سمجھا جاتا۔ میں نے کونسل کے اراکین کو کہا کہ اس بل کو عورتوں کے حقوق کی نظر سے دیکھیں جن میں ہماری، ماں، بیٹی، بہن بھی شامل ہے۔ ہمیں صرف بیوی پر دھونس جمانے کے لیے اس بل کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن مولویوں کو عورت کے نام میں صرف بیوی نظر ہی آتی ہے جیسا کہ وہ غلام ہوتی ہے۔ میں طبعی طور، سوائے ان ذمہ داریوں کے جو فی الجنس مخصوص ہیں، باقی معاملات میں عورتوں اور مردوں کے برابر کے حقوق کے حق میں ہوں۔ اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو Feminist سمجھتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حفظ مراتب اور شرم وحیا سے بالاتر ہوں۔ بدلتی دنیا کے تقاضوں کے پیش نظر عورت کو سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور سائنسی دنیا میں وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو مردوں کے ہیں کیوں کہ دونوں ”نفس واحدہ“ سے پیدا ہوئے ہیں اور دونوں سے نظامِ کائنات چلتا ہے۔ دھونس، دھاندلی کا قبائلی نظام جدید دنیا میں نہیں چل سکتا۔ بدقسمتی سے مسلم دنیا میں اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا رہا۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کونسل کے اندر بسا اوقات دوران بحث شیرانی صاحب بے محل، سیاق وسباق سے ہٹ کر ازدواجی معاملات کے ایسے نکتے زیر بحث لاتے رہے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نقل کفر کفر نہ باشد کے طور پر صرف اشارتاً اتنا ہی درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ مشت زنی، دبر وفرج، بوس و کنار، وطی وغیرہ کو بلا محل زیر بحث لا کر مزے لینا۔ اس سے ان لوگوں کی بنیادی پرورش اور ماحول کی

عکاسی ہوتی ہے۔ آئین، حکومت اور فوج کی ملامت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا بھی اس سیاسی سوچ اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس کی یہ نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک میٹنگ میں تو چند علمائے کرام آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ مولانا طاہر اشرفی اور مولانا شیرانی نے تلخ کلامی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے گریبان کو پکڑ لیا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ غیر مولوی ممبران چپ سادھ لیتے اور چیئرمین کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ کر بہت مایوس ہوا اور استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے چند دوستوں سے مشورہ کیا جنھوں نے ایسا کرنے سے اتفاق نہیں کیا کہ آپ اپنی رائے کے ذمہ دار ہیں نہ کہ مولانا کے طرزِ عمل کے۔ اپنا موقف زبانی اور تحریری طور پر پیش کر دیا کریں، ریکارڈ پر بات رہنا چاہیے۔ میں نے یہ مشورہ مناسب سمجھا کیوں کہ ریاض اختر چوہدری صاحب کے چیف جسٹس بنتے وقت اگر میں نے استعفیٰ دے دیا ہوتا تو سپریم کورٹ آزاد کشمیر میں اصلاح کی کوئی گنجائش اور امکان نہ رہتا۔

میں نے بطور ممبر کونسل تین تحریری تجاویز بھجیں جن میں سے ایک چاند دیکھنے کا کام محکمہ موسمیات کی سفارشات سے مشروط کر دینا اور بے نور آنکھوں والے متنازع مولویوں کو اس کی رائے کا پابند کر دینا تھا کیوں کہ یہ لوگ بھی ان ہی کے آلات سے چاند تلاش کرتے ہیں اور اسی دنیا میں جب چاند اور سورج گرہن، موسمیاتی تبدیلیوں وغیرہ کے آنے والے ہزاروں سال کا یہ پتا دے دیتے ہیں جو درست ثابت ہوتا ہے، تو اس سائنسی طریقہ سے اس جگ ہنسائی سے نجات مل سکتی ہے جو عید اور رمضان پر دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن اس کو ایجنڈے میں نہیں لایا گیا۔

میں نے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر فنی تعلیمی اداروں میں اسلام کی معاشرتی اور اخلاقی تعلیم کے لیے نصاب تجویز کرنے کی بھی ایک تحریک کی جس کے بعد ایسا ہوا۔

تیسری تجویز مساجد کو سرکاری تحویل میں لے کر اوقاتِ اذان، نماز، اور جمعہ وعیدین کا یکساں خطبہ دینا جس میں شہری، ازدواجی، معاشی، معاشرتی، انتظامی اور بین الاقوامی امور کی نسبت درس دینے کا نصاب موجود ہو، تا کہ فرقہ پرستی کی بجائے انسان اور وطن دوستی کی تعلیم ہو۔

میری یہ پختہ رائے ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین بین الاقوامی شہرت کے حامل فقہ، آئین، قانون، اقتصادیات، بین الاقوامی قانون، ادب اور انتظامیہ کے ماہر لوگوں پر مشتمل ہونی

چاہیے۔ مدرسوں اور خانقاہوں کے فارغ التحصیل لوگوں کی ماضی کے [358] عصری علوم کی روشنی میں دینی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن اب فی زمانہ عصری اور تقابلی علوم کے حامل علماء کی ضرورت ہے۔ سیاسی جماعتوں اور فرقہ پرست نمائندوں کی تو اسلامی نظریاتی کونسل میں کوئی گنجائش ہی نہیں، بھلے وہ کتنے ہی بڑے عالم دین کیوں نہ کہلاتے ہوں۔

موازنہ

میرا کشمیر کے دونوں حصوں اور ہندوستان و پاکستان سے تعلق رکھنے کے پس منظر میں موازنے کے طور پر کچھ لکھنا مناسب ہوگا گو کہ اس کتاب کے مختلف حصوں میں کشمیر کے دونوں حصوں کا سیاسی اور سماجی زندگی کے کچھ پہلوؤں کا موازنہ بین السطور درج ہے۔ بہ این ہمہ چند سیاسی، انتظامی اور قانونی پہلوؤں کا مختصر موازنہ کیا جانا، دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا تا کہ حقیقت حال کا ادراک کیا جائے۔

ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کے آئین کا حصہ ہے جس میں پاکستانی حصہ بھی شامل سمجھا جاتا ہے، گو کہ ہندوستان کے آئین میں کشمیر کے پاکستانی حصوں کو آئین کی مختلف دفعات کے تحت الگ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں ریاست کشمیر کی تعریف اور الیکشن کے مقاصد کے لیے حد بندی وغیرہ شامل ہے جبکہ پاکستانی حصہ پاکستان کے آئین میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی آئین کے تحت پورے کشمیر پر دعویٰ ہے۔ تاہم دفعہ 257 کے تحت اس وعدہ کا اظہار ہے کہ جب ریاست کے لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے تو الحاق کی شرائط ان کی مرضی کے مطابق طے کی جائیں گی۔ اس دفعہ کی منشا کے مطابق کشمیر کو سوائے الگ ملک ہونے کے تمام حقوق دیئے جا سکتے ہیں جس میں کنفڈریشن کی حیثیت بھی ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے زیر کنٹرول کشمیر کو ہندوستان کے آئین کے تحت اس سے زیادہ حقوق حاصل ہیں جو دیگر ہندوستانی شہریوں کو حاصل ہیں، جبکہ پاکستان کے زیر کنٹرول کشمیر کے علاقے کے لوگوں کو وہ حقوق بھی حاصل نہیں جو ملک کے دیگر حصوں کو حاصل ہیں۔

ہندوستان والے حصے میں کشمیری لوگوں کو ہندوستان اور کشمیر کے آئین کے تحت بہ یک وقت بنیادی حقوق اور اعلیٰ عدلیہ کو ان کے نفاذ کا الگ الگ اختیار حاصل ہے، جبکہ پاکستانی حصے میں ایسا نہیں ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً ساری بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کشمیر کے دونوں حصوں میں سیاسی اور پارلیمانی سرگرمیوں میں حصہ دار ہیں لیکن پاکستانی حصے میں مرکزی جماعتیں اپنے ساتھ ''آزاد کشمیر کا لاحقہ'' لگا کر سیاست کرتی ہیں اور ان کا مرکزی جماعتوں کی تنظیم میں کوئی مقام نہیں ہے جبکہ ہندوستانی حصے میں ریاست کے اندر کارفرما مرکزی جماعتوں کا اتنا ہی مقام ہے جتنا ہندوستان کے باقی صوبوں کا۔

چنانچہ کشمیر یا ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں درج ووٹر پارلیمنٹ کے کسی بھی حلقے سے الیکشن لڑسکتا ہے جبکہ آزاد کشمیر میں یہ نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کی مرکزی جماعتوں اور مرکزی حکومت میں کشمیر کی نمائندگی ویسے ہی ہوتی ہے جیسے باقی صوبوں کی۔ جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں۔

وادی کشمیر میں مرکزی جماعتوں کو نہیں بلکہ مقامی جماعتوں کو فوقیت دی جاتی ہے جبکہ پاکستانی حصوں میں مرکزی جماعتوں کو مقامی جماعتوں پر عام لوگ ترجیح دیتے ہیں جن کے ذریعہ مرکز میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرتے ہیں۔

کشمیر کے دونوں حصوں میں مقامی حکومتیں مرکز کی مرضی کے مطابق ہی بنتی اور چل سکتی ہیں لیکن ہندوستانی حصے میں مرکز کے پالیسی اور فیصلہ ساز اداروں میں نمائندگی کی وجہ سے مداخلت کی سطح سوائے سلامتی کے امور کے، وہ نہیں ہے جو پاکستانی حصوں میں ہے جہاں ان کو نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ جس وجہ سے مرکز کی اسٹیبلشمنٹ کو بالادستی حاصل ہے۔

ہندوستانی کشمیر میں آئین ہند کے علاوہ ریاست کا آئین بھی نافذ ہے آئین ہند کا وہ حصہ نافذ نہیں جو ریاستوں سے متعلق ہے جس میں ریاستی آئین ہی نافذ ہے لیکن پاکستانی حصوں میں پاکستانی آئین بالکل نافذ نہیں جبکہ مقامی آئین کے تحت ہی حکومت پاکستان کو براہ راست اور بذریعہ

آزاد کشمیر کونسل اختیار دیئے گئے ہیں۔

کشمیر کے دونوں حصوں پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے دونوں ملکوں نے دونوں حصوں کے آئین میں ایک جیسی دفعات رکھی ہیں جن کے تحت مرکز کی بالادستی قائم ہے اور ان دفعات کی ترمیم بھی نہیں کی جاسکتی۔ آزاد کشمیر کے آئین کی دفعہ 33 اور ہندوستانی کشمیر کے آئین کی دفعہ 147 کے تحت آئین کی ان دفعات کی ترمیم پر پابندی ہے جن کے تحت ان علاقوں پر دونوں ملکوں کی گرفت ہے۔ ہندوستان کی تو سمجھ آسکتی ہے کیوں کہ کشمیری اس کے خلاف ہیں، نہ معلوم پاکستان نے کیوں رکھی ہیں جہاں پاکستان کے خلاف کوئی نہیں۔ خودمختار کشمیر کے حامل بھی پاکستان کے خلاف نہیں۔

انتظامی سطح پر ہندوستانی کشمیر اندرونی انتظام وانصرام میں پاکستانی کشمیر کے حصوں کے مقابلے میں زیادہ بااختیار ہے کیوں کہ وہاں مرکزی بیوروکریسی مقامی کشمیری حکومت کے ماتحت ہے اور اس کی پالیسوں کا اسی طرح نفاذ کرنے کی پابند ہے جیسے باقی صوبوں میں ہوتا ہے۔ جبکہ پاکستانی حصوں میں مرکزی بیوروکریسی مقامی حکومتوں کے نہیں بلکہ مرکز کے کنٹرول میں ہے اور وہی ان کی تقرری اور تبادلے کرتی ہے۔

ہندوستانی کشمیر کے تینوں حصوں جموں، کشمیر اور لداخ میں لوگوں کی سیاسی ترجیحات مختلف ہیں جموں اور لداخ ہندوستان نواز جبکہ وادی کشمیر پاکستان نواز اور ہندوستان مخالف ہے۔ پاکستانی حصوں کی ترجیحات پاکستان نواز لیکن اندرونی طور پر گلگت بلتستان کے لوگ آزاد کشمیر کو پسند نہیں کرتے جبکہ آزاد کشمیر ان کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے۔ آزاد کشمیر میں کچھ لوگ خودمختار کشمیر کے حق میں بھی ہیں لیکن گلگت بلتستان میں ایسا نہیں ہے۔ تاہم ہندوستانی ساختہ ایک کاغذی تنظیم گاہے گاہے بیرون ملک پاکستان کے خلاف پرچار کرتی ہے لیکن زمین پر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

آزاد کشمیر کے آزادی پسند یا قوم پرست لوگ ووٹ مرکزی جماعتوں کو دیتے ہیں جبکہ ہندوستانی کشمیر میں وادی کے قوم پرست لوگ مقامی جماعتوں کو دیتے ہیں۔

ہندوستانی حصے میں لوگ مرکزی عدالتی نظام، الیکشن کمیشن اور سی بی آئی پر مقامی ایجنسیوں

کے مقابلے میں زیادہ اعتماد کرتے ہیں کیوں کہ وہ حکومتی دباؤ میں نہیں آتے۔ تاہم ریاست کی پرانی مقامی جماعت نیشنل کانفرنس مقامی نظام کو زیادہ ترجیح دیتی ہے کیوں کہ مقامی لوگوں پر برس ہا برس کا ان کا کنٹرول ہونے کی وجہ سے وہ مقامی نظام کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ سپریم کورٹ آف انڈیا پر لوگ زیادہ اعتماد کرتے ہیں تاہم مقامی ہائی کورٹ پر بھی ویسا ہی بھروسا ہے بشرطیکہ اس کا چیف جسٹس اور جج غیر مقامی ہوں۔ ریاستی ہائی کورٹ کا چیف جسٹس عمومی طور باہر سے آتا ہے۔ یہ نظام پورے ہندوستان میں رائج ہے کہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقامی صوبے سے نہیں ہوتا۔ ملکی سلامتی کے معاملات میں ہندوستانی عدلیہ آزاد اور خودمختار ہونے کے باوجود ڈنڈی ماردیتی ہے لیکن مجموعی طور پر ان تین اداروں پر لوگ بھروسا کرتے ہیں۔ جبکہ آزاد کشمیر میں لوگ مقامی عدلیہ اور انتظامیہ، لیکن پاکستانی ایجنسیوں پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر کی عدلیہ نے باقی ملک کی عدلیہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اب تقرریوں میں سیاسی مداخلت اور کچھ ججوں کی برادری اور علاقہ پرستی کی وجہ سے اس کا بھرم ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جبکہ ہندوستانی کشمیر میں عدلیہ پر سیاسی کنٹرول نہیں ہے۔ ہندوستانی کشمیر میں عدلیہ سیاسی طور کبھی اتنے بحرانوں کا شکار بھی نہیں ہوئی جتنا آزاد کشمیر میں ہوئی ہے۔

ہندوستانی کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ آئین کے ذریعہ مربوط کیا گیا ہے جبکہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو یہاں کی مقامی آئینی دستاویزات کے تحت مرکز کے ساتھ باندھا گیا ہے مرکزی کے آئین میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ مقبوضہ کشمیر کا آئین ساز اسمبلی کی سفارش پر جبکہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے آئین پاکستان نے نافذ کیے ہیں۔

ہندوستانی فوج کا ریاست میں مقامی سطح کی انتظامیہ میں عمل دخل نہیں ہے لیکن مرکزی سطح پر چیف منسٹر کشمیر کی نگرانی میں فوج کو پالیسی بنانے کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے جو بی ایس ایف، سی آر پی، ایف آئی بی اور را پر مشتمل ہے۔ ان کے ذریعہ وہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جبکہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں یہ عمل دخل دونوں سطحوں پر ہے۔

جنرل اشفاق پرویز کیانی کے آرمی چیف بننے کے بعد سے مقامی سطح کی انتظامیہ اور سیاست میں یہ عمل دیکھنے میں محسوس نہیں ہوا جن کو جنرل راحیل شریف نے بحال رکھا ہے۔

ہندوستانی کشمیر میں سول معاملات میں بدانتظامی پیدا کرنے یا جرم سرزد ہونے کی صورت میں فوج کے خلاف بھی سوائے سپیشل پاور ایکٹس کے اسی طرح کیس رجسٹر ہوتے ہیں جس طرح عام لوگوں کے خلاف لیکن پاکستانی کشمیر میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ مرکزی حساس اداروں پر ہندوستانی کشمیر کے عام لوگ بالکل اعتماد نہیں کرتے لیکن پاکستانی کشمیر میں مقامی اداروں کے مقابلے میں مرکزی حساس اداروں پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی کشمیر میں مقامی حکومت سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر بنائی اور چلائی جاتی ہے جبکہ پاکستانی حصوں میں برادریوں کا اتحاد غالب ہے۔ لیکن اپنی برادری کا اپنی اور مخالف جماعتوں کے اندر لوگوں کا باقیوں کے مقابلے میں زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔

ہندوستانی کشمیر میں 1990 کی تحریک کے بعد حکومتی اقدامات اور احکامات پر تحریک آزادی حریت کانفرنس میں شامل لوگ بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو ہندوستانی حکومت کی پالیسی کا حصہ ہے۔ اور آزاد کشمیر حکومت میں باقی فیکٹرز کے علاوہ حریت کانفرنس بھی اثر انداز ہوتی ہے جس سے مقامی حکومت کی خودمختاری مزید کمزور پڑ گئی ہے۔

کشمیر کے دونوں حصوں میں مقامی حکومتیں اپنی بقا کے لیے ان علاقوں میں مرکز کو بے جا مداخلت کا موقع دے کر اس کی گرفت کو مضبوط کرتی ہیں۔ اور جب حزب اختلاف میں ہوتی ہیں، تو اس کا رونا روتی ہیں۔

ہندوستان کے باقی حصوں میں کشمیریوں پر بھروسا نہیں کیا جاتا نہ ان کو تحفظ میسر ہے، جبکہ پاکستان بھر میں کشمیریوں پر بھرپور بھروسہ کیا جاتا ہے اور کسی تعصب کا شکار نہیں ہیں۔

آزاد کشمیر کے لوگوں کا مرکزی سروسز میں کوٹہ مقرر ہونے کے علاوہ جس صوبے میں کشمیری لوگ بستے ہیں وہاں اوپن میرٹ میں ان کو اتنا ہی حقدار سمجھا جاتا ہے جتنا باقی لوگ ہیں۔

1947 سے لے کر اس وقت تک جتنے کشمیری لوگ پاکستان میں آباد ہوئے ہیں وہ کاروبار اور باقی معاشی زندگی میں اپنی اپنی محنت کے مطابق بھرپور طریقے سے مستفید ہو رہے ہیں۔ لیکن ہندوستانی کشمیر کے لوگوں کا ہندوستان کے باقی حصوں میں، سوائے کشمیری ہندوؤں کے، وہ معاشی مقام نہیں ہے جو پاکستان میں ہے۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے پاکستانی سیاست و قیادت اور وہاں آباد ہونے والے لوگ آزاد کشمیر کے لوگوں کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے مخالف ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس سے مسئلہ کشمیر ختم ہو جائے گا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ان کے دبدبے میں فرق آ جائے گا کیوں کہ آزاد کشمیر کے رہائشی لوگوں کا بھی مرکزی حکومت میں وہ مقام بن جائے گا جو ان کا اور باقی پاکستانیوں کا ہے۔ جبکہ ہندوستانی کشمیر کے لوگ ہندوستان کے خلاف متحرک بھی ہیں لیکن مرکزی سیاست اور قیادت میں بھی بھرپور کردار ادا کرتے ہیں، جیسا کہ آزادی سے قبل مسلم لیگ اور کانگریس کرتے تھے۔

تعلیمی لحاظ سے ہندوستانی کشمیر کے لوگ زیادہ آگے اور کوالٹی ایجوکیشن کے حامل ہیں۔ تاہم پاکستانی حصوں میں ان علاقوں کی شرح خواندگی ہندوستانی حصہ سے زیادہ لیکن کوالٹی میں بہت پیچھے ہے۔

سرینگر اور جموں سے درجنوں معیاری انگریزی اخبار شائع ہوتے ہیں اور مرکزی میڈیا میں ان کا رول زیادہ نمایاں اور فعال ہے جبکہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان ایسا مقام حاصل نہیں کر سکا ہے۔

آزاد کشمیر کے مرکزی اداروں اور کاروبار میں شامل لوگ زیادہ تر آزاد کشمیر سے باہر آباد ہونے کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ ہندوستانی کشمیر کے ایسے لوگ کشمیر میں واپسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

تعمیر و ترقی کے لحاظ سے آزاد کشمیر ہندوستانی کشمیر سے بہت آگے جبکہ گلگت بلتستان نسبتاً پیچھے ہے۔ وہاں جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ آغا خان فاؤنڈیشن کی وجہ سے ہے۔ لداخ اور کارگل میں تعمیر و ترقی کے لحاظ سے لداخ بہت آگے ہے جو مرکز اور اندرونی اقتصادی خودمختاری کی وجہ سے ہے۔

کرپشن کے اعتبار سے ہندوستانی کشمیر اپنا ثانی نہیں رکھتا جہاں قومی اور غیر قومی دھارے کے لوگ برابر کے مجرم ہیں جبکہ آزاد کشمیر میں کرپشن کا لیول کم ہے، گلگت بلتستان اور لداخ میں سب سے کم کرپشن ہے جو ہے بھی وہ مرکزی اسٹیبلشمنٹ کی وجہ سے ہے۔

مقبوضہ کشمیر کے لوگ جب ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جاتے ہیں وہاں وہ خود اور باقی ہندوستانی ان کو اجنبی سمجھتے ہیں جبکہ یہی لوگ جب پاکستان آتے ہیں تو ہر طرح سے اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر یا گلگت بلتستان سے اگر کوئی مقبوضہ کشمیر چلا جائے اس کو وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں ہے حالاں کہ ریاستی باشندہ کے قانون کے تحت اس کا حق ہے لیکن اگر مقبوضہ کشمیر سے کوئی آزاد کشمیر یا پاکستان آئے تو اس کو ریاستی باشندے کے طور پر کسی بھی جگہ آباد ہونے کا حق دیا جاتا ہے۔

لوکل پرمٹ پر کشمیر سے آزاد کشمیر آنے والے پاکستان کے کسی بھی حصے میں جا سکتے ہیں۔ لیکن آزاد کشمیر سے مقبوضہ کشمیر جانے والے ہندوستان کے کسی حصے میں نہیں جا سکتے بلکہ کشمیر کے اندر بھی کچھ علاقوں میں مقامی انتظامیہ کی اجازت سے ہی جا سکتے ہیں۔

ریاست کے دونوں حصوں کے لیڈر بغیر کسی کاروبار، معقول اور معروف ذرائع آمدن کے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی محل نما مکانوں میں گزار رہے ہیں۔ اور دنیا بھر میں کشمیر کے مسئلے کے نام پر گھومتے گھامتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ کے حل ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں رہے گا جس کی وجہ سے دونوں حصے کے لیڈر صورت حال بحال رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مقبوضہ کشمیر میں مزاحمتی لیڈر شپ غیر متعلقہ ہوتی جا رہی ہے اور تیسری نسل اپنے طور پر تحریک چلا رہی ہے۔

تجربات (حاصل زندگی)

اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے میں نے جو سبق سیکھے ہیں، وہ وصیت کے طور نئی نسلوں کی نذر کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

انسان قدرت کی تخلیق کا بہترین شاہکار ہے جس کے اندر وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو کائنات میں موجود ہیں۔ یہ کائنات کی تمام مخلوق میں سے افضل ترین مخلوق ہے جس کے اندر وہ تمام خیر و شر، نیکی و بدی پائی جاتی ہے جو کسی بھی مخلوق میں ہے اس لیے اس کو ان تمام خوبیوں اور برائیوں سمیت ماننا چاہیے۔ اس کی عزت و تکریم اپنی عزت اور تکریم اور اس کے خالق کی تکریم ہے۔

بحیثیت انسان دنیا بھر کی مخلوق کے کام آنا انسان کے بس میں نہیں ہے لیکن جہاں تک ہو سکتا ہے وہی انسان کی دنیا ہے، ان کے بھرپور کام آنا انسانی معراج ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، ہر ایک سے نیکی اور حسن سلوک کرنا لازم ہے لیکن کسی اور شخص کا حق مار کر کسی کے ساتھ نیکی کرنا، نہ صرف ان دونوں بلکہ اللہ کے ساتھ دشمنی ہے۔ اللہ اپنا حق معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اپنے بندے کی حق تلفی کرنے والے کو معاف نہیں کرتا، اس کا اختیار صرف حق دار کے پاس ہے۔ میرے نزدیک سب سے بڑا گناہ ناانصافی اور حق تلفی ہے جس سے نظام متاثر ہوتا ہے۔ ناانصافی تمام معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

ہر ایک سے نیکی بغیر صلے کے ارادے کے کی جائے اور اس کو بھول جائے، مبادا کہ اس کے

ہاتھوں تکلیف پہنچنے کی صورت میں اس پر احسان جتلا کر نیکی تلف ہو جائے۔ حق دار کا حق واجب ہونے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ جس کا کام کسی انسان کے بس میں ہو جائز ہونے کی صورت میں فوراً کر دیا جائے اور ناجائز یا ناممکن ہونے کی صورت میں بھی فوراً خندہ پیشانی سے معذرت کی جائے تاکہ وہ کوئی اور کام کر سکے۔ جب کسی کام کی حامی بھر لی جائے تو اپنی جان کی قیمت پر بھی اس کو کرنا چاہیے اگر نہ کر سکے تو معافی ضرور مانگ لینی چاہیے۔ ''ہاں'' اور ''نہ'' سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور نہ کرنے کی ہمت پیدا کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ نہ نہ کرنے کی وجہ سے گومگو کی کیفیت میں دوسرے کا نقصان ہو جائے۔ کسی فقیر، مسکین اور در پر آئے گداگر کو خالی ہاتھ نہ جانے دیں کیوں کہ وہ دینے والا سمجھ کر آپ کے پاس آتا ہے اور دینا اللہ کی صفت ہے۔ وقت سے پہلے اور حیثیت سے زیادہ لیا ہوا ہضم نہیں ہوتا اس سے بچنا لازمی ہے۔ اپنی آمدن کا کچھ حصہ بلا تاخیر خیرات کریں یہ اس خیرات سے الگ ہو جو باقی آمدن سے زکوۃ کی صورت میں ہو۔ خیرات اور صدقات تعلیم و تربیت، بیماروں اور بے کسوں کے لیے استعمال کریں۔

اپنی ذمہ داری ادا کر کے نتائج اللہ پر چھوڑنے چاہئیں۔ اپنی کوشش اور محنت کے بغیر نتائج آپ کی خواہشات کے مطابق نہیں ہو سکتے بھلے دن رات سجدے میں رہیں۔ ہر معاملہ میں اللہ کی ذات پر بھروسا رکھنا چاہیے لیکن اپنی عقل اور فکر کو فضول سمجھ کر نہیں، اللہ کی دی ہوئی نعمت کو استعمال کر کے۔ تعلق واسطہ نبھانے میں کوتاہی نہ کریں یہ قطع رحمی ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ انسان ساری دنیا کے کام نہیں آ سکتا، اپنے، والدین، بیوی، بچے، پوتے، پوتیاں، بہن، بھائی اور قرب و جوار کو اپنی دنیا سمجھیں۔ ان کو اپنی دنیا کی انتہا سمجھیں، ان کے ہر کام آئیں لیکن جو کچھ ان کے لیے کریں صرف ان کے لیے خالص ہو، اس میں اپنا کوئی حصہ نہ رکھیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں مشاورت ضروری ہے لیکن ترجیح بچے بچیوں کی پسند کو دیں۔ جوڑا پسند کرتے وقت اس کے خاندان کو ضرور زیر نظر رکھیں لیکن اصل حیثیت جوڑے کی ہے، وہ بے جوڑ نہ ہو۔ ترجیحاً شادی بیاہ اپنے جانے پہچانے خاندان، علاقے اور آزمائے ہوئے متعلقین میں کریں۔ بچیوں کو زندگی بھر بچیاں ہی سمجھیں، ان کو بچوں کی ماں یا کسی کی بیوی نہ سمجھیں۔ بیٹوں کی آزادانہ زندگی گزارنے کی حوصلہ افزائی کریں۔ نصیحت تنہائی میں کریں۔

زندگی کا ہر لمحہ آخری لمحہ سمجھیں لیکن تیاری سو برس کی رکھیں۔ کمائی اپنے اور اپنے زیر کفالت کے لیے کریں اور اس کا 70 فیصد خرچ کریں۔ باقی حصہ بچت، خیرات، تحفہ تحائف کے لیے رکھیں زندگی سب کچھ اپنا سمجھ کر گزاریں، لیکن زندگی اس کی نذر نہ کریں۔ اصول پر ڈٹ جائیں لیکن صائب مشورہ مان لیں۔ غلطی تسلیم کر کے اپنی اصلاح کر لیں۔ انتقام ذہن و دل کے کسی گوشے میں نہ رکھیں۔ لین دین اور ادھار میں احتیاط برتیں یہ تعلقات کی خرابی کی بنیاد بنتے ہیں۔ اگر کسی کو دینا ہو تو واپس نہ ملنے کا اندیشہ اور اس کے نتائج کو سامنے رکھ کر دیں۔ لوگوں پر اپنی بات ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں، متنازع ہونے کی صورت میں اجتناب کریں۔ لیکن جہاں ناانصافی اور ظلم ہو رہا ہو، وہاں نہ بولنا ظلم کی معاونت ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ایمان کا حصہ ہونا چاہیے۔

دنیا کی سیر کریں اور اس سے زندگی کا سلیقہ سیکھیں۔ جس کام سے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، اس کو کرنے میں کوئی امر مانع نہیں سمجھنا چاہیے۔ سچ بولنا جان و ایمان کا حصہ سمجھیں لیکن جہاں اس کو بولنے کی ضرورت نہ ہو یا وہاں بولنے سے فساد برپا ہو وہاں خاموشی اور کنارہ کشی اختیار کریں۔ جھوٹ بولنے سے اگر فتنہ ٹلتا ہو تو وہ اس سچ سے بہتر ہے جس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ بھروسا صرف آزمائے ہوئے پر کریں۔ زندگی کا کوئی کارآمد لمحہ ضائع نہ کریں خواہ وہ راستے سے کانٹا ہٹانے ہی کا کیوں نہ ہو۔

مطالعہ کو غذا کی طرح اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ جو پڑھا اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں حتیٰ کہ قرآن پاک بدوں معانی و تفسیر کے پڑھنے کے علم کی کوئی ایسی کتاب پڑھ لی جائے جو سمجھ آسکے۔ عبادات رسم نہیں، ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کریں۔ جس فقہ یا مسلک کی جو بات آپ کی حس لطیف کو پسند آئے اور قرآن و سنت کے اصولوں کے خلاف نہ ہو اس کو اپنا لیں۔ کولہو کے بیل کی طرح نہ ہو جائیں۔ فی زمانہ رائج سائنس اور ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھائیں یہ عملی علم کا حصہ اور قدرت کا عطیہ ہے۔ علم کو دینی اور دنیاوی خانوں میں نہ بانٹیں بلکہ علم کو سمجھ کر بہتری کے لیے استعمال کریں۔

صحت مند زندگی کے لیے کسی بھی قسم کی جسمانی مشق ضروری ہے اگر یہ کوئی Productive ہو تو سب سے اچھا ہے جیسا کہ کچن گارڈن۔ وقت پر کھانا، وقت پر سونا اور اٹھنا، وقت کی پابندی کرنا،

منصوبہ بند زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ کسی کی مدد کرنے میں ذات، برادری، علاقہ، مذہب کو خاطر میں نہ لائیں یہ یاد رکھیں کہ دنیا تب تک ہی آپ سے وابستہ ہو گی جب تک آپ اس کے کام آئیں یا جب تک اس کو آپ کا متبادل نہیں مل جاتا۔ تبدیلی کو قبول کریں اور بدلے ہوئے حالات میں ڈھل جائیں۔ اختیار و اقتدار میں ایسے رہیں کہ اس کے ختم ہونے یا چھن جانے پر کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ ہر انسان کی حیثیت اور اہمیت کا ایک ٹائم زون ہوتا ہے، اس کے گزر جانے کے بعد اس کو خاموشی سے اپنی عزت بچا کر کوئی اور کام کرنا چاہیے۔

بے رخی اور دوستی میں اعتدال برتیں، بچوں کو صرف تعلیم نہیں تربیت بھی دیں جو وقت دینے سے ممکن ہے۔ اپنے رشتہ داروں، تعلق داروں، دوستوں اور ملنے والوں سے بچوں کو بھی ملائیں تاکہ تعلق کا رشتہ نہ ٹوٹ پائے۔ نعمت، صحت دولت اور خوشی پر شکر کریں اور نہ ملنے کی صورت میں صبر کریں، دونوں کا اجر ملتا ہے۔ جو چیز دوسروں میں بری لگتی ہے، وہ اپنے آپ میں پیدا نہ ہونے دیں۔ اگر آپ میں بھی وہ بری بات موجود ہو تو دوسرے کو نہ کوسیں۔ احسان مندی عظیم ترین عمل ہے، کسی کے احسان کو نہ بھولیں اور احسان کا بدلہ احسان سے دیں۔ لیکن خود کیا ہوا احسان بھول جائیں۔ نیکی، مہربانی اور احسان مندی، خدائی صفات ہیں، ان کو جاری رکھیں۔ لیکن احسان اور مہربانی کرنے میں احتیاط ضرور کریں۔ یہ بالاہتمام نہیں بلکہ Spontaneous ہونے کی صورت میں بلا بغض و عناد کریں، لالچ، تحریف، ذاتی دلچسپی یا پسند و ناپسند ہونے کی بنا پر نہ کریں، یہ عموماً گلے پڑتا ہے۔ اگر ممنون احسان ومہربانی، جواب میں طوطا چشمی، احسان فراموشی، احسان شکنی یا نقصان پہنچائے تو جان لو کہ اس کی کردار اور شخصیت سازی میں کوئی فرق رہا ہے جو عمومی طور پر حرام یا بھیک کے رزق کھانے سے ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم ہوتے ہیں۔

زندگی کا ایک مقصد مقرر کر کے اس کو حاصل کرنے کی جہد و جہد کریں، کامیابی یقینی ہو گی۔ جو کام اپنائیں اس میں مہارت حاصل کریں بولنے سے زیادہ سننے کی عادت ڈالیں۔ کم ظرف سے اتنی نیکی نہ کریں، جس سے وہ زیادہ لوگوں کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں آ جائے جس کی ذمہ داری آپ

پر بھی ہوگی۔ زندگی میں ایسے کام کریں جو لکھنے پڑھنے اور تقلید کرنے کے قابل ہوں۔ اچھے اخلاق، اچھی عادات، اچھی سوچ، صاف ذہن، صاف نیت ہی انسانیت کی معراج ہے۔ جو چھن گیا، اس کو بھول جاؤ، جو پالیا اس پر قناعت کرو۔ خواہش محدود رکھو ان کا حصول آسان ہوتا ہے۔ نہ خوشامد کرو اور نہ سنو۔ نہ غیبت کرو اور نہ سنو۔ کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرو، اس سے بچنے کی کوشش کرو۔

سہاروں کی تلاش میں نہ رہو بلکہ سہارا بنو۔ اپنے فن میں کمال کی مہارت حاصل کرو اور دوسروں میں منتقل کرتے رہو تا کہ فن کا تسلسل بحال رہے۔ دنیا میں کوئی شخص ناگزیر نہیں ہے۔ لیکن اس جیسا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ زندہ لوگوں کی قدر کرو ان کے کام آؤ، آخرت میں اس کے لیے صرف اپنے اعمال ہی کام آئیں گے، آپ کا رونا دھونا، تعریف و توصیف نہیں۔ اس کی عظمت کا اظہار، خوبیوں کا اعتراف اس کی زندگی میں کرو۔ مذہب نہیں بلکہ مذہب کی تعبیر و تشریح زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، اس کو قبول کرنا بقا نوع کے لیے ضروری ہے۔ جھگڑا کسی چیز پر نہیں کرنا چاہیے مذہب پر تو بالکل نہیں کرنا چاہیے مذاہب کی بنیادی تعلیمات ایک جیسی ہوتی ہیں، ان کا اطلاق لوگ اپنے اپنے مفاد میں کرتے ہیں۔ زندگی کے اور زندگی میں، فیصلے سوچ سمجھ کر عقل، فکر اور تدبر سے کرنے چاہئیں۔ جذبات یا خواہشات کے تحت نہیں۔ اللہ سے رہنمائی، مدد، نصرت اور مغفرت کے لیے ہمیشہ کے لیے طلبگار رہیں اور اس کی رحمت پر ہمیشہ بھروسہ رکھیں لیکن اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کر کے نہیں، ان کو پورا کر کے۔

جس ملک یا علاقے میں رہیں، وہاں کے قوانین رسم و رواج اور لوگوں کا احترام کریں۔ اختلاف باعزت اور باوقار طریقے سے کریں، کسی کی تذلیل یا تحقیر کے لیے نہیں۔ دوسرے کی بات سنو، سمجھو اور سمجھاؤ۔ ممکن ہے دو میں سے ایک غلطی پر ہو اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ ہر روز نئی بات سننے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو کیوں کہ زندگی کا ہر لمحہ نیا لمحہ ہوتا ہے اس کے نئے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہر شخص سے بات اس کی علمی اور عقلی سطح کے مطابق کرو۔ بات اپنے عمل اور کردار سے سمجھاؤ تکرار سے نہیں۔ نصیحت اور تنبیہ تنہائی میں کرو وگرنہ یہ بے عزتی ہوگی نصیحت نہیں۔ بلا تصدیق و غور و فکر بات کو نہ پھیلاؤ۔ عیبوں اور رازوں کو پردے میں رہنے دو، اسی میں عافیت ہے۔ مشورہ حکمت، بھلائی اور عافیت پر مبنی دیں کسی کی خواہش یا اس کو خوش کرنے کے لیے نہیں۔ کسی عمل کا معروف اور قانونی ہونا ہی کافی نہیں، اس کا جائز، منصفانہ اور اخلاقی ہونا بھی لازمی ہے۔ مفلسی اور امارت ہمیشہ رہنے والی نہیں، ہر حال میں ایسے رہو کہ مفلسی اور امارت آپ پر غالب نہ آ جائے۔ اچھی بات کرنا بہت اچھی بات ہے، لیکن نیک نیتی سے بات کرنا سب سے اچھی بات ہے۔ اپنے سے کم تر کسی کو نہ سمجھو، ہر شخص کو اللہ نے کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے، اس کو اتنی ہی عزت دو جتنی تم اپنے لیے توقع رکھتے ہو۔ جو شخص جس سطح کا ہے، اس کو اس سے کم تر یا اس سے زیادہ نہ بناؤ، یہ ناانصافی ہے۔ ہر ایک کو اپنے سے بہتر سمجھو۔ عاجزی، انکساری، نرم خوئی، صلح جوئی، نیک نیتی، حق گوئی، صاف گوئی کو ایمان کا حصہ سمجھو۔ لوگوں کی اور اپنی عزت علم و عمل کی بنا پر کرو اور کرواؤ، شر کے خوف سے نہیں۔